اسالیب تفسیر قرآن اور نظم ومناسبات

جواد حیدر ☆

(گزشتہ سے پیوستہ)

قرآن مجید کی تفسیر اور اس کے معانی ومفاہیم کو واضح کرنے کے سلسلے کا آغاز اُسی وقت ہو گیا تھا جب اللہ ربّ العزت نے آخری پیغمبر جناب محمد مصطفیٰ ﷺ پر یہ قرآن نازل فرمانا شروع کیا۔ قرآن کریم کی تبیین وتفسیر کی ابتدائی اور حتمی صورتیں یہ تھیں:

(۱) اللہ تعالیٰ قرآن حکیم کے الفاظ نازل فرماتا اور ساتھ اس کے معانی بھی اپنے نبیؐ پر وحی کر دیتا اور آنجناب علیہ الصلوٰۃ والسلام اسے صحابہؓ تک پہنچا دیتے۔

(۲) اللہ ربّ العزت کی جانب سے نبی اکرم ﷺ پر الفاظِ قرآنی نازل فرمائے جاتے اور نبی اکرم ﷺ اُن کو سمجھ لیتے اور اُن پر عمل شروع کر دیتے۔ جو بات سمجھی جاتی اس پر مزید وحی نہ اترتی تو جان لیا جاتا کہ یہی مرادِ الٰہی ہے۔ گویا یہ تقریر اُوحیٰ الٰہی بن جاتی۔ اور اگر اس کی تفہیم میں کوئی دقت ہوتی یا کوئی تفصیل طلب بات ہوتی تو اللہ تعالیٰ اور وحی اُتار دیتے' ورنہ نبی اکرم ﷺ اسی پر عمل کرتے اور صحابہ کو اسی کی تعلیم دیتے اور صحابہ نبی اکرم ﷺ کے انہی سمجھے گئے معانی ومفاہیم کو آگے نقل کر دیتے۔

(۳) قرآن مجید نبی اکرم ﷺ پر اترتا جو عموماً آپؐ اور آپ کے صحابہؓ کے حالات کے موافق راہنمائی ہوتی۔ یعنی کوئی ایسی صورت حال پیش آتی یا ایسا واقعہ رونما ہوتا جو وحیٔ الٰہی کا محتاج ہوتا تو اللہ ربّ العزت اس موقع پر وحی اتار دیتے اور یہی سب سے بڑی حکمت تھی قرآن مجید کو تیئیس سال کے طویل عرصے میں اتارنے کی کہ موقع بہ موقع قرآن کو اتارا جائے' ورنہ اسے تورات کی طرح یکبارگی بھی اتارا جا سکتا تھا۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم اس سے جو کچھ سمجھتے اس پر عمل کرتے اور اس کو آگے نقل کر دیتے۔ مزید یہ کہ یہ امر ناممکنات میں سے ہے کہ دورِ نبوت

☆ شعبہ تحقیق اسلامی' قرآن اکیڈمی لاہور

ہی میں قرآن مجید کی غلط تبیین وتفسیر کی گئی ہو اور اس پر اللہ رب العزت نے خاموشی بھی اختیار فرمائی ہو۔ جو شخص بھی ایسا سمجھتا ہے صریح غلطی پر ہے۔

اب سوال یہ ہے کہ کیا ان سمجھے گئے معانی و مفاہیم کے ساتھ قرآن آگے نقل کیا گیا یا محض الفاظ ہی آئندہ نسلوں تک منتقل کیے گئے؟

اس بات پر ساری اُمت کا اجماع ہے اور اس میں کسی شک وشبہ کی بھی گنجائش نہیں ہے کہ قرآن مجید کے الفاظ مع مفاہیم ومراد آگے نقل کیے گئے' وہ مفاہیم جو نبی مکرم ﷺ پر اتارے گئے یا نبی اکرم ﷺ نے خود سمجھے یا صحابہ کرامؓ نے دورِ نبوت میں سمجھے اور ان پر تقریراً اصابت کی مہر لگ گئی۔ یہ تینوں صورتیں چونکہ صراحتاً یا تقریراً وحی ہیں اس لیے ہمارا موقف یہ ہے کہ یہ تینوں شکلیں بر بنائے وحیٔ الٰہی محفوظ ہیں اور یہ نہیں ہوسکتا کہ وحیٔ الٰہی ختم کر دی گئی ہو' یا قیامت تک آنے والے افراد سے اوجھل کر دی گئی ہو۔ ساری کی ساری وحی نقل ہوئی ہے اور کوئی شیطانی قوت اسے دورِ آخر تک پہنچانے میں رکاوٹ نہ بن سکی ہے اور نہ بن سکے گی (ان شاء اللہ)' اس لیے ہمارا کہنا ہے کہ دورِ نبوت کے بعد تفسیرِ قرآن میں صحابی کے اجتہادی قول کے علاوہ صحابی کا صحیح سند سے ثابت شدہ ہر قول اور ہر مقبول حدیث نبویؐ محفوظ ہے اور قرآن مجید کی اوّلین تفسیر ہے۔

وہ شخص قرآن مجید پر بڑا ہی ظلم کرتا ہے جو یہ سمجھتا ہے کہ قرآن مجید اُمت تک بغیر مفہوم و مراد کے پہنچا دیا گیا اور اُمت اس کے جملہ مفاہیم خود سمجھنے کی محتاج ہے۔ اور یہ کہ قرآن مجید کی تفہیم میں نبی مکرم ﷺ اور صحابہ کے سمجھے گئے معانی و مفاہیم پر ہماری سمجھ برتر حیثیت رکھتی ہے (نعوذ باللہ من ذلک)۔ اور دوسری بڑی بات یہ گمان باطل ہے کہ یہ وحی (نعوذ باللہ) غیر محفوظ ہے۔ کاش یہ خیال کرنے والے لوگ اس بات کو سمجھیں کہ قرآن مجید سے ہمارے سمجھے گئے مفاہیم و معانی اصل ''میزان'' نہیں ہو سکتے' بلکہ دورِ نبوت میں اترنے والی وحی ہی اصل ''میزان'' ہے' جس کی حفاظت کی ذمہ داری اللہ رب العزت نے خود لے رکھی ہے اور ایسے اسباب مہیا کر دیے ہیں کہ یہ وحی قیامت تک محفوظ کر دی گئی ہے۔

ہمارے موقف کو چند نکات میں سمیٹا جا سکتا ہے:

☆ قرآن مجید اُمت کو ایسے ہی نہیں تھما دیا گیا کہ ہر شخص اپنی عقل اور اپنی سمجھ کے مطابق اس کے مفہوم و مراد بناتا پھرے' بلکہ قرآن مجید کے معانی' اس کی مراد اور اس کے مفاہیم بھی اُمت تک پہنچائے گئے ہیں۔

☆ جس طرح قرآن مجید کے الفاظ محفوظ ہیں بعینہٖ اس کے مفاہیم بھی محفوظ ہیں جو متکلم کی حقیقی مراد ہیں۔

☆ اگر اس کے مفاہیم و مراد کو غیر محفوظ سمجھا جائے تو قرآن مجید معجزہ نہیں رہتا۔

☆ نبی مکرم ﷺ نے جہاں اس کے الفاظ پہنچائے ہیں وہیں اس کے معانی و مطالب اور مراد بھی اپنی اُمت کو سمجھائی ہے۔

☆ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم قرآن مجید کے اوّلین مخاطب تھے۔ اگر یہ کہا جائے کہ قرآن صحابہؓ کو سمجھ نہیں آیا تو لازم آتا ہے کہ قرآن مجید بلیغ کلام نہیں ہے۔

☆ صحابہؓ نے دورِ نبوت میں قرآن مجید سے جو سمجھا اس کے غلط ہونے پر وحی نہیں اتری تو قرآن مجید کے یہ معانی حتمی ہو گئے' کیونکہ یہ ناممکن ہے کہ دورِ نبوت ہی میں قرآن غلط سمجھا جانے لگا ہو۔

☆ صحابہؓ چونکہ سبھی عادل ہیں' نیز نبی مکرم ﷺ کے تربیت یافتہ ہیں' اس لیے دورِ نبوت کے بعد بھی ان کی طرف سے بیان کیے گئے قرآن مجید کے معانی لائق حجت ہیں' اِلّا یہ کہ اُن کا تعلق صحابہؓ کے اجتہاد سے ہو' کیونکہ قرآن مجید کی تفسیر میں صحابہ کے اجتہادات کا مسئلہ مختلف فیہ ہے کہ آیا وہ قابل حجت ہیں یا نہیں؟

چونکہ قرآن حکیم صحابہ کے حالات اور ان کو پیش آمدہ ضروریات کے مطابق اُترا کرتا تھا اس لیے صحابہ ان کے معانی اور آیات کی مکمل تفصیل بخوبی سمجھتے تھے۔ اور اِن صحابہؓ کے حالات کو سمجھنے والے تابعین کرامؒ ہیں' لہٰذا تفسیر میں ان کا قول بھی معتبر حیثیت رکھتا ہے' بالخصوص مجاہد' عطاء' عکرمہ' طاؤس' سعید بن جبیر رحمہم اللہ جیسے بزرگ علم التفسیر میں ایک خاص ملکہ رکھتے ہیں۔

یہ دائرہ کار ہے قرآن مجید کی تفسیر بالمنقول کا۔ اور یہی قرآن مجید کی تفسیر کے داخلی وسائل ہیں کہ متکلم یا تو اپنے کلام کے معانی خود بتلا دے یا اس کے سامنے کوئی اس کے کلام کے معانی بتلائے اور وہ خاموش رہے۔

پھر اس کی روایت کا مرحلہ ہے اور اس بارے میں ہم یہ سمجھتے ہیں کہ کسی بات کی حفاظت میں جو معیار محدثین نے مقرر کیے ہیں ان سے بڑھ کر اور کوئی معیار پیش کیا ہی نہیں جا سکتا۔ مزید برآں حدیث نبویؐ یا قول صحابی (ذاتی استدلال کے علاوہ) صریحاً یا تقریراً وحی ہونے کی وجہ سے بھی محفوظ ہیں۔ اس بنا پر ہم کہہ سکتے ہیں کہ محدثین کے معیارات کی بنا پر صحیح احادیث کی

جانچ پڑتال کر دی گئی ہے باوجود یکہ ایک کثیر تعداد ضعیف احادیث کی بھی موجود ہے۔اس لیے تفسیر میں حدیث نبویؐ اور قول صحابیؓ کی حیثیت یقیناً اس سے بہت بڑھ کر ہے جو انسانی عقل کی ہے۔لیکن چونکہ نبی مکرم ﷺ نے فرمایا ہے کہ:

((وَلَا يَشْبَعُ مِنْهُ الْعُلَمَاءُ وَلَا يَخْلُقُ عَنْ كَثْرَةِ الرَّدِّ وَلَا تَنْقَضِي عَجَائِبُهُ)) (۳۴)

''علماء اس سے سیر نہ ہو سکیں گے' بار بار پڑھنے سے قرآن مجید سے اکتاہٹ نہ ہوگی اور نہ ہی اس کے عجائب ختم ہونے والے ہیں''۔

اس لیے لوگوں نے قرآن مجید سے خوب تسکین حاصل کی اور جہاں اس سے دلوں کو اطمینان ملا وہاں عقل نے بھی خوب لذت حاصل کی۔لیکن اس کے معانی و مفاہیم کی تعیین میں علماء نے عقل کو بھی کھلا نہیں چھوڑ دیا کہ جو چاہے من مانی تأویل کرتا چلا جائے اور اپنے تئیں یہ سمجھے کہ وہ مفہوم جو میں نے سمجھا ہے مرادِ الٰہی ہے۔مرادِ الٰہی کے تعین میں معیار وہی ہے جس کا تذکرہ ہم کر چکے۔باقی سب کچھ علماء کی نکتہ آفرینیاں ہیں۔

اس حوالے سے امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''علم تفسیر کا مدار یا تو صحیح روایت پر منحصر ہے یا پھر محققانہ استدلال پر''۔(۳۵)

انسانی جہد اور عقل سے کشید کی گئی تفسیر کے علاوہ صحیح روایات سے حاصل ہونے والی تفسیر ''نقل صحیح'' کہلاتی ہے اور عقل سلیم کے ذریعے انسانی جہد و کاوش پر مشتمل تفسیر ''محققانہ استدلال''۔ علماء کے ہاں اسی کو تفسیر اور تأویل کے فرق سے بھی جانا جاتا ہے۔

امام سیوطیؒ نے ابونصر القشیریؒ کا قول نقل کیا ہے کہ:

التفسير مقصور على الاتباع والسماع والاستنباط مما يتعلق بالتاويل (۳۶)

''تفسیر کا انحصار (منقولات کے) سماع اور اتباع پر ہے' جبکہ استنباط کا تعلق تاویل سے ہے''

اسی طرح ایک اور قول نقل کیا ہے۔فرماتے ہیں:

ما وقع مبينا في كتاب الله ومعينا في صحيح السند سمي التفسير الآن معناه قد ظهر و وضح وليس لاحد ان يتعرض اليه باجتهاد ولا غيره بل يحمله على معنى الذى ورد لا يتعداه والتاويل ما استنبط

العلماء العاملون لمعانی الخطاب الماهرون فی آلات العلوم (۳۷)

''تفسیر صرف اسی کو کہتے ہیں جو کتاب اللہ میں واضح طور پر بیان کر دیا گیا اور صحیح سند سے اس کا تعین ہو گیا۔ اس سے اس کا معنی کھل کر واضح ہو جاتا ہے اور کسی کے لائق یہ نہیں کہ اپنے اجتہاد یا کسی اور چیز کے بل بوتے پر اس سے اعراض برتے' بلکہ بغیر زیادتی کے اس کو اسی مقام پر رکھے جس بارے وہ وارد ہوئی۔ اور تاویل سے مراد وہ مسائل ہیں جو مختلف علوم وفنونِ اسلامیہ کے ماہر علماء نے الفاظِ قرآن کے مفہوم سے مستنبط کیے ہیں۔

ایک اور قول ذکر کیا ہے:

التفسیر یتعلق بالروایة والتاویل یتعلق بالدرایة (۳۸)

''تفسیر کا تعلق روایت سے ہے اور تاویل کا تعلق درایت سے ہے۔''

اسی بات کو نئے اسلوب سے مزید واضح کرتے ہوئے برصغیر کے معروف عالم دین حافظ عبداللہ محدث روپڑیؒ نے ''درایت تفسیری'' اور ''درایت اجتہادی'' کے نام سے یاد کیا ہے۔ درایت تفسیری کے بارے میں فرماتے ہیں:

''درایت تفسیری کلام کے ظاہری مطلب کو کہتے ہیں جس کو اہل زبان اپنے محاورہ میں بے تکلف سمجھتے ہیں۔ چنانچہ ہم اپنی بول چال میں ایک دوسرے کے مافی الضمیر پر بے تکلف آگاہ ہو جاتے ہیں اور اس کا مطلب سمجھنے سے کوئی چیز حائل نہیں ہوتی''۔ (۳۹)

روپڑی صاحب نے درایت تفسیری ہی میں تفسیر القرآن بالقرآن' بالحدیث اور باقوال الصحابہ والتابعین کا ذکر کیا ہے۔ (۴۰) اس سلسلے میں آپ نواب صدیق حسن خان کا قول نقل کرتے ہیں:

''صاحب قرآن کی تفسیر قرآن وحدیث سے ہاتھ نہ لگے تو پھر صحابہؓ کے اقوال سے لینا چاہیے' اس لیے کہ انہوں نے احوال وقرائن اس وقت کے دیکھے بھالے ہیں' وہ قرآن کے نزول کے وقت حاضر وموجود تھے' فہم تام' علم صحیح' عمل صالح رکھتے تھے۔ یہ بات بہت بعید ہے کہ وہ قرآن کی تفسیر بیان کریں اور انہوں نے رسول خدا سے اس کو سنا نہ ہو۔ یہ بھی اگر مانا جائے کہ انہوں نے نہیں سنا تو بھی وہ ان عربوں میں سے ہیں جو لغت عرب کے تل تل سے واقف تھے' بال کی کھال نکالتے تھے۔ خصوصاً جو اُن میں بڑے

عالم تھے' جیسے چاروں خلفاء اور ابن مسعود و ابن عباس''۔(۴۱)

اور درایت اجتہادی کے بارے میں لکھتے ہیں:

''درایت اجتہادی استنباط کو کہتے ہیں جیسے نحوائے کلام سے کسی مطلب پر مطلع ہو جانا یا دو تین باتوں کو ملا کر ان سے ایک نتیجہ نکالنا یا باعث کلام یا مقتضی حال یا وضع متکلم کو دیکھ کر کوئی بات استخراج کرنا وغیرہ وغیرہ۔ الغرض عبارت کے سرسری مطالب کے علاوہ جتنے معانی ہیں سب درایت اجتہادی میں داخل ہیں''۔(۴۲)

عقل سلیم اس بات کو بخوبی سمجھتی ہے کہ کلام کا ایک مفہوم وہ ہے جو متکلم خود بتائے یا کلام کے وہ ظاہر و باہر مطالب ہیں جنہیں مخاطب بآسانی سمجھ لیتا ہے اور متکلم بھی جانتا ہوتا ہے کہ یہ ایسی بات ہے جو سب کو سمجھ آ سکتی ہے۔ کلام کے ان سرسری مفاہیم کے علاوہ گہرائی میں جا کر انسانی عقل کا استعمال کرتے ہوئے مفاہیم اخذ کرنا درایت اجتہادی ہے اور یہ بات واضح ہے کہ اجتہاد درست بھی ہو سکتا ہے اور غلط بھی۔ نیز طبائع و عقول مختلف ہونے کی بنا پر ایسے مقامات پر اختلاف ایک فطری امر ہے' جیسا کہ اس میدان میں قدم رکھنے والوں کی اپنی تحریروں میں بھی نظر آتا ہے۔

قرآن حکیم کی تفسیر کے حوالے سے امام ابن تیمیہؒ فرماتے ہیں:

''ہمارے خیال میں جو شخص صحابہ یا تابعین کے اقوال سے علیحدہ کوئی صورت اختیار کرے گا وہ بدعتی ہے' اگرچہ یہ اصول ہی کیوں نہ ہو کہ مجتہد سے اگر لغزش ہو تو قابل درگزر ہے''۔(۴۳)

صحابہ و تابعین کے اقوال کے حوالے سے علمائے سلف کا یہ موقف ہے تو قابل غور بات یہ ہے کہ ان تفاسیر کا کیا مقام ہے جن میں اس بات کا بطور خاص التزام کیا گیا ہو کہ ان میں تفسیری روایات و احادیث سے یکسر پہلوتہی کی جائے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر اس اصول کو بناءِ تفسیر کہا جائے کہ ''حدیثِ رسولؐ کی حیثیت خارجی وسائل کی ہے''۔ ہماری نگاہ میں ایسی تفاسیر تمام تر ظاہری خوبیوں کے باوصف متذکرہ بالا فتویٰ ہی کے ذیل میں آئیں گی۔

رہا یہ سوال کہ تفسیر قرآن میں نظم قرآن کی کیا حیثیت ہے؟ تو اس سوال کا جواب تفصیل کا متقاضی ہے۔ کیونکہ نظم قرآن کی بھی کئی اقسام ہیں جن پر مفصل گفتگو پچھلے شمارے میں قارئین ملاحظہ فرما چکے ہیں۔ استدلال کے حوالے سے اجمالاً نظم کی دو ہی قسمیں ہیں:

(۱) ایسا نظم جو کلام کا حصہ ہے اور اپنے اندر ایسا سادہ مفہوم رکھتا ہے جس پر عامی شخص بھی

بآسانی مطلع ہو جاتا ہے۔ جیسے سبب و مسبب کا تعلق ہے یا تاکید و مؤکد کا' بدل و مبدل کا ربط ہے یا اجمال و تفسیر کا' یا دیگر کوئی بھی ایسا انداز جو کلام کا حصہ ہی ہو یا ظاہری طور پر آسانی سے سمجھ آ جائے اور اس میں اجتہادی کوششوں کا دخل نہ ہو تو اس بارے میں کسی کا اختلاف نہیں ہے کہ ایسا کلام اور اس سے حاصل شدہ مفہوم لائق حجت اور قابل استدلال ہے۔ امام سیوطی ایسے کلام کے بارے فرماتے ہیں کہ: لا کلام فیه (٤٤) یعنی ایسے کلام میں تو کسی کا کوئی اختلاف نہیں ہے' سب ہی اسے درست تسلیم کرتے ہیں' بلکہ ایسے ربط کو کلام کا حصہ ہی مانتے ہیں۔ ایسا نظم تو ہر کلام اور ہر تحریر میں ملتا ہے اس لیے اس پر کسی کا اختلاف بھی نہیں ہے۔

(۲) اختلاف نظم کی اس قسم میں ہوا ہے جس کے بارے نہ تو الہامی ہدایات موجود ہیں اور نہ ہی وہ کلام کا حصہ ہے' بلکہ دو مختلف چیزوں کو جوڑنے اور مختلف النوع اشیاء کو ملانے کی قبیل سے ہے۔ یعنی دو یا دو سے زیادہ ایسی اشیاء کہ بظاہر تو ان میں کوئی ربط و تعلق نظر نہیں آتا' لیکن ان کے بارے میں کوئی ایسا انداز اپنایا جائے یا کوئی ایسی بنیاد تلاش کی جائے جو ان مختلف اشیاء کو ایک آہنگ میں جوڑ دے۔ یہ تلاش چونکہ خالصتاً انسانی کوشش سے تعلق رکھتی ہے' یعنی تفسیر بالرائے کی قبیل سے ہے' تو اس کا مقام وہی سمجھا جائے گا جو تفسیر بالرائے کا ہے۔ اور اسے درج ذیل شرائط کے بعد قابل غور سمجھا جائے گا:

(۱) قرآنی تعلیمات کے موافق ہو' یعنی اس کی واضح نصوص کے مخالف نہ ہو۔

(۲) حدیث صحیح کے مخالف نہ ہو' یعنی جب کسی مسئلہ کے بارے میں حدیث نبوی آ جائے تو اسے چھوڑ کر اپنی عقل سے تلاش کیے گئے نظم کو اہمیت نہ دی جائے۔

(۳) اگر کسی آیت کریمہ کے مفہوم پر اجماع ہو تو اپنی کوشش کر کے نیا مفہوم پیش کرنا' چاہے وہ نظم سے حاصل کردہ ہو یا کسی اور اسلوب سے' بدعت و گمراہی کی دلدل میں قدم رکھنے کے مترادف ہے۔

(۴) کسی صحابی کے ایسے قول کے مخالف نہ ہو جس کا تعلق اس کے استدلال یا استنباط سے نہیں بلکہ مرفوع حکمی سے ہے۔

(۵) عربی لغت کے خلاف نہ ہو۔ تلاش کیا گیا ایسا نظم جو عربی قواعد و زبان کے موافق نہ ہو لائق اعتناء نہ جانا جائے گا۔

تفسیر بالرائے کی بنیادی شرائط تقریباً یہی ہیں اور یہی دائرہ کار ہے اُس نظمِ قرآن کا جو

نظم کی مؤخر الذکر قبیل سے تعلق رکھتا ہے۔ اَسلاف میں سے نظم کے حوالے سے جس کا بھی نام پیش کیا جاتا ہے وہ اس دائرے سے نہ نکلا اور نہ ہی اس نے ان حدود کو پار کرنے کی جسارت کی۔ کیونکہ مذکورہ بالا شرائط کے حصار کو توڑ کر نئی راہ پر چلنے والا منزل مقصود تک نہیں پہنچ سکتا' اور اگر پہنچ بھی جائے تو اس کا اپنایا گیا طریقہ اور اس کی منتخب کی گئی راہ غلط ہونے کی وجہ سے نظر انداز کرنے کے لائق ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ قسم ثانی سے متعلق نظم قرآن کی راہ پر چلنا ایسی راہ اپنانا ہے جس کا انسان کو مکلف نہیں ٹھہرایا گیا۔ اور یہ محض رائے اور گمان سے کام لینا ہے جس کا التزام کم از کم قرآن مجید کے بارے میں جائز نہیں۔ نیز یہ کہ نظم قرآن تکلف و تصنع ہی ہے جو دین اسلام میں پسندیدگی کی نگاہ سے نہیں دیکھا جاتا۔ اور پھر اگر تفسیر قرآن اور فہم قرآن میں اصول کے طور پر اسے لازم قرار دیا جائے تو قرآن مجید بلیغ نہیں رہتا۔

تفسیر میں نظم قرآن کو لازم قرار دینے سے قرآن بلیغ نہیں رہتا

اس نکتے پر بات سے قبل ضروری ہے کہ ''بلاغت'' کو جانا جائے کہ اس سے کیا مُراد ہے۔ صاحب معجم الوسیط لکھتے ہیں کہ علمائے بلاغہ کے ہاں اس کی تعریف درج ذیل ہے:

مطابقة الكلام لمقتضى الحال مع فصاحته (٤٥)

''کلام کا فصاحت کے ساتھ مقتضی الحال کے موافق ہونا بلاغت ہے''۔

علامہ القزوینی لکھتے ہیں:

هي مطابقة الكلام لمقتضى الحال مع فصاحة الفاظه (٤٦)

''بلاغت کلام کا فصیح الفاظ کے ساتھ مقتضی الحال کے مطابق ہونا ہے''۔

اسی طرح دیگر تمام علماءِ بلاغت اس کلام کو بلیغ سمجھتے ہیں جو مقتضائے حال کے مطابق ہو' اور مقتضائے حال کے موافق ہونے سے مراد یہ ہے کہ حالات کے پیش نظر' مخاطب کی حیثیت کے مطابق کلام کیا جائے' جیسا کہ بعض روایات میں بھی آیا ہے کہ ہمیں لوگوں کے عقول کے مطابق کلام کا حکم دیا گیا ہے۔ اگرچہ الدیلمی وغیرہ کی ان روایات میں کلام ہے' لیکن بخاری میں حضرت علی رضی اللہ عنہ کی موقوف حدیث موجود ہے کہ:

((حدثوا الناس بما يعرفون اتحبون ان يُكَذَّبَ اللّٰهُ ورسولُه)) (٤٧)

''تم لوگوں سے اس انداز میں بات کیا کرو جس سے وہ واقف ہیں (ورنہ وہ غلط سمجھیں

گے)۔ کیا تم پسند کرو گے کہ اللہ اور اس کے رسول کو جھٹلایا جائے؟''

گویا اس کا مطلب یہ ہوا کہ جو شخص جس صلاحیت کا مالک ہے اس سے اس کے مطابق کلام کیا جائے۔ اگر مخاطب عالم ہے تو اس سے اس کے معیار کا کلام کیا جائے' مخاطب جاہل ہے تو اس سے اس سادہ اور عامیانہ انداز میں بات کی جائے جسے وہ بآسانی سمجھ لے۔ بچے سے اس کی حیثیت کے مطابق بات کی جائے۔ اور اگر ایسا نہ ہو' یعنی مخاطب کی پہنچ سے بلند تر کلام کیا جائے' تو ایسے کلام کو غیر بلیغ کلام کہا جائے گا۔

ہمارا دعویٰ یہ ہے کہ قرآن مجید سے بڑھ کر کوئی کلام بلیغ ہو ہی نہیں سکتا۔ اور اس کی بلاغت اسی میں ہے کہ جہاں اس کے الفاظ فصیح تر ہیں وہاں یہ اپنے مخاطبین کی عقول کے مطابق بات کرتا ہے' جسے مخاطبین بآسانی سمجھتے ہیں' اس کے مطالب و مفاہیم سے فیض یاب ہوتے ہیں۔ اور یہ ایسا کلام ہے جسے ہر سطح کا آدمی پڑھ کر اس کے معانی و مفاہیم سے آگاہ ہو کر اپنے لیے ہدایت کا سامان کر لیتا ہے' لیکن اگر اس کی تفہیم و تبیین کے لیے نظم قرآن کی شرط لگا دی جائے' جیسا کہ بعض لوگوں نے عائد کی ہے' تو اس کا لازمی نتیجہ یہ نکلے گا کہ قرآن عام لوگوں کی کتاب نہ رہے گی بلکہ صرف ان چند مٹھی بھر لوگوں کے لیے ہی رہ جائے گا جو نظم قرآن کے اسرار پا لینے کا دعویٰ کرتے ہیں اور ان کی تعداد پوری اسلامی تاریخ میں شاید درجن بھر بھی نہ ہو۔ ظاہر ہے کہ یہ رویہ عام لوگوں کو قرآن مجید سے دور کرنے اور تقلیدی رویے کو فروغ دینے کے مترادف ہوگا۔

اس سلسلے میں ایک اور بات یاد رکھنے کی ہے کہ قرآن مجید تیئیس سال کے طویل عرصے میں اُترا' جس کی تکمیل نبی مکرم ﷺ کی حیاتِ مبارکہ تک جاری رہی۔ اگر تفہیم و تفسیر قرآن میں نظم قرآن کی شرط لگائی جاتی تو [illegible] کا یہ دورِ نبوت کے آخر تک' جب تک قرآن مجید مکمل نہ ہو گیا تھا' کسی کو سمجھ ہی نہ آیا اور نہ ہی کوئی اس کی تفسیر کر پایا' کیونکہ نظم تکمیل اور ترتیب کا متقاضی ہے۔ یہ اس بات کی واضح دلیل ہے کہ اگر قرآن مجید نزول کی تکمیل سے قبل صحابہ اور خود جناب نبی مکرم ﷺ کو سمجھ آتا تھا تو وہ یقیناً بغیر اُس نظم کے تھا جسے بلاضرورت فہم قرآن کے لیے لازمی شے قرار دے دیا گیا ہے۔

نظم قرآن کی اس قسم کے لیے ماہرانہ ذہن درکار ہے جو لغت و ادب میں کمال رکھنے کے ساتھ ساتھ ایک شاعر کی سی خوبیوں کا حامل ہو' جبکہ نبی مکرم ﷺ اور ان کے تربیت یافتہ صحابہ

کرامؓ قرآن مجید کو تکلف کے بغیر سادہ انداز میں پڑھتے اور راہِ ہدایت کا سامان کرتے۔ جیسا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ سے پوچھا گیا کہ ﴿فَاكِهَةً وَّاَبًّا﴾ کا کیا معنی ہے؟ تو فرمانے لگے کہ ''ای سماء تظلنی وای الارض تقلنی ان انا قلتُ فی کتاب اللّٰہ ما لا اعلم'' یعنی کون سا آسمان مجھ پر سایہ کرے گا اور کونسی زمین میرا بوجھ اٹھائے گی اگر میں کتاب اللہ میں بغیر علم کے بات کروں؟ اور حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے یہ کہہ کر خاموشی اختیار فرمائی تھی کہ ''انّ ھذا ھو التکلف یا عمر'' کہ اے عمر یہی تو تکلف ہے! گویا وہ اسی بات کو پسند کرتے تھے جو انہیں نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے بتلائی تھی اور قرآن مجید نے انہیں اُمی بتلایا ہے۔ اس سے بھی یہ بات واضح ہوتی ہے کہ وہ قرآن مجید کو سمجھتے تھے لیکن تکلفات اور عقلی موشگافیوں سے بالا رہ کر۔ قرآن مجید کا فرمان ہے:

﴿فَاٰمِنُوْا بِاللّٰهِ وَرَسُوْلِهِ النَّبِيِّ الْاُمِّيِّ الَّذِيْ يُؤْمِنُ بِاللّٰهِ وَكَلِمٰتِهٖ وَاتَّبِعُوْهُ لَعَلَّكُمْ تَهْتَدُوْنَ﴾ (الاعراف)

''تو تم اللہ اور اس کے بھیجے ہوئے اَن پڑھ نبی پر ایمان لاؤ' (ایسا نبی) جو اللہ اور اس کی باتوں پر ایمان رکھتا ہے اور تم اسی کی پیروی کرو تا کہ تم ہدایت پالو۔''

اور فرمایا:

﴿هُوَ الَّذِيْ بَعَثَ فِي الْاُمِّيّٖنَ رَسُوْلًا مِّنْهُمْ يَتْلُوْا عَلَيْهِمْ اٰيٰتِهٖ وَيُزَكِّيْهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتٰبَ وَالْحِكْمَةَ﴾ (الجمعۃ:۲)

''وہی ہے جس نے اَن پڑھ لوگوں کی طرف ان ہی میں سے ایک رسول بھیجا جو اُن پر اس کی آیات کی تلاوت کرتا ہے' ان کا تزکیہ کرتا ہے اور انہیں کتاب وحکمت کی تعلیم بھی دیتا ہے۔

نبی مکرم صلی اللہ علیہ وسلم خود بھی اُمی تھے اور آپ کی بعثت خصوصی بھی اُمیین کے لیے تھی۔ آپ ان کو قرآن' اس کے احکام اور حکمت بھری باتیں سکھاتے تھے' جیسا کہ متذکرہ بالا آیات میں ارشاد ہوا' اور اگر ادبی ولغوی اسالیب اور نظم کے دقیق رموز بھی سمجھاتے تو قرآن یقیناً اس کا بھی ذکر کرتا۔ البتہ یہ بات اپنی جگہ ایک حقیقت ہے قرآن مجید کا طرزِ بیان اور محاسن ایسے تھے کہ لبید' جس کے ایک شعر پر سبعہ معلقات کے مصنفین نے اسے سجدہ کیا' پکار اٹھا کہ کیا قرآن مجید آجانے کے بعد بھی شاعری جاری رکھی جائے؟